© rasailojaraid.com

عالمی سرمایہ داری کا مستقبل

عبد القدیر سلیم

دوسری جنگ عظیم کے اختتام (۱۹۴۵) سے پہلے ہی تیسری جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہ سرد جنگ تھی، جو دنیا پر چالیس عشروں سے زیادہ عرصے تک مسلط رہی اور ۱۹۹۰ میں سوویت یونین کے انہدام کے بعد عملاً ختم ہو گئی۔ سی ڈبلیو ملز (C.W. Mills) کا خیال ہے کہ جنگ کے آخر میں امریکہ نے جاپان پر جن ایٹمی ہتھیاروں کے تجربے کیے تھے، وہ دراصل روس کے خلاف تھے۔ یہ روس کو انتباہ تھا کہ اسے اپنی حدود میں رہنا چاہیے اور عالمی تسلط کی خواہش اور خواب کو ترک کر دینا چاہیے (The causes of Third World War)۔ جیسا کہ سب ہی جانتے ہیں، اس جنگ کے دو فریق تھے: نام نہاد "آزاد دنیا" جس کا سرخیل امریکہ تھا، اور اس کے اتحادی: مغربی یورپ اور برطانیہ تھے، اور دوسری طرف روس، مشرقی یورپ کے اشتراکی ممالک اور چین وغیرہ تھے۔

یہ دراصل دو معاشی، سیاسی فلسفوں کی جنگ تھی، دو نظریات کا ٹکراؤ تھا، جن کے ابتدائی مفکرین تو تاریخ کے گہرے دھندلکوں میں کہیں گم ہیں، لیکن ان کے موجودہ نمایندے انگلستان کا عیسائی مفکر، ایڈم اسمتھ (۹۰-۱۷۲۳) اور جرمنی کا یہودی نژاد انقلابی مفکر، کارل مارکس (۸۳-۱۸۱۸) تھے۔ ایڈم اسمتھ گلاسگو کی جامعہ میں اخلاقیات کا پروفیسر تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ معاشیات پر سائنسی انداز میں سب سے پہلے اس نے قلم اٹھایا، اور دولت اقوام (The Wealth of Nations) تصنیف کی۔ یہ کتاب جدید سرمایہ دارانہ معاشیات کی بائیبل تصور کی جاتی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ حرص اور خود غرضی چونکہ انسان کے خمیر میں شامل ہیں، اس لیے اگر تمام افراد کو اپنے اپنے مفادات کی تکمیل کی پوری پوری آزادی دے دی جائے تو سخت محنت کے نتیجے میں بالآخر دولت کی ریل پیل ہو گی، اور اس میں سب کا بھلا ہو گا۔ یہ آزاد تجارت اور منڈی کی معیشت کا پہلا منضبط فلسفہ تھا۔

کارل مارکس نے انسانی معاشرے اور معیشت کا ایک زیادہ عمیق اور انسان دوست فلسفہ پیش کیا۔ وہ تاریخ اور معاشروں کا جدلیاتی، طبقاتی تصور سامنے لایا، اور یہ نظریہ پیش کیا کہ دولت اور اشیا میں قدر،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دراصل محنت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ دولت آفرین، دراصل محنت کش مزدور ہے، جس کا ہر زمانے میں استحصال ہوتا رہا ہے۔ اب ایک انقلاب، جدلیاتی منطق کا تقاضا ہے، جس کے بعد: "ہر ایک سے اس کی صلاحیت کے مطابق اور ہر ایک کو اس کی ضرورت کے لحاظ سے" دیا جائے گا۔ اس نے دنیا بھر کے محنت کشوں کو صدا دی: "دنیا کے مزدورو! متحد ہو جاؤ، تمھارے پاس گنوا دینے کے لیے سوائے زنجیروں کے کچھ نہیں"۔

انیسویں صدی کا آخر اور بیسویں صدی کا نصف اول ان دو نظریات کے ٹکراؤ کی تاریخ کی داستان سے بھرا ہوا ہے۔ کارل مارکس اور اس کے ساتھیوں کی کوششوں سے بین الاقوامی اشتراکی تحریکیں وجود میں آئیں، اور نظام سرمایہ داری کے خلاف تلخ اور خونیں جدوجہد کا آغاز ہوا۔ ۱۹۱۷ میں روس میں پہلا اشتراکی انقلاب آیا۔ اسپین اور پھر دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر مشرقی یورپ کے بڑے حصے پر اشتراکیت کا تسلط ہو گیا، اور پھر چین، کیوبا اور بعض دوسرے علاقوں میں اشتراکیت فاتح بن کر ابھری۔

تاہم بیسویں صدی کا سرمایہ دار مغرب اب وہ نہیں رہا تھا جو ایڈم اسمتھ، ٹی۔ ایچ گرین (۱۸۳۶-۸۳ء، برطانوی فلسفی اور سیاسی، سماجی مصلح) اور مارکس کے عہد میں تھا۔ کچھ تو اشتراکی انقلابی تحریکوں کے خوف سے، اور کچھ دوسری اصلاحی اور انسان دوست تحریکوں کے زیر اثر، سرمایہ داری نے بھی اپنے منافع کا تھوڑا سا حصہ، محنت کشوں اور پس ماندہ عوام میں تقسیم کرنا شروع کر دیا تھا۔ نوآبادیات کے استحصالی کردار، نیز صنعت، تجارت اور سائنس کے فروغ سے یورپ، شمالی امریکہ، آسٹریلیا اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں خوش حالی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

تاہم ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ مغرب نے جس طرح کی سائنس، صنعت اور کاروبار کو فروغ دیا، اس کے نتیجے میں ایک زاویے سے دیکھیں تو انسان کی زندگی ابتر بھی ہوئی ہے۔ یا زیادہ صحیح یہ بات ہوگی کہ اس "ترقی" کے نتیجے میں باعتبار کیفیت، زندگی کو جتنا بہتر ہو جانا چاہیے تھا، وہ ویسی نہیں ہوئی۔

میرے خیال میں اس کی بڑی وجہ "نفع" کا وہ داعیہ ہے، جو آج کی معیشت کے کارخانے کی واحد قوت متحرکہ ہے۔ سائنس، جدید فنیات اور انصرام (management) کے نئے اور بہتر کارگزار طریقوں کی وجہ سے پیداوار میں جو اضافہ ہوا ہے، اسے ٹھکانے لگانے کی بھی ضرورت پڑتی ہے (چاہے کسی کو اس اضافی مصنوع / "پیداوار" کی ضرورت ہو یا نہ ہو)، اور پھر بڑھتی اور "ترقی پذیر" معیشت کا تقاضا ہے کہ نئی نئی چیزیں بازار میں لائی جائیں (چاہے کسی کو اس "نئی مصنوع" کی ضرورت ہو یا نہ ہو)۔ پھر اس پیداوار کثیر اور نئی پیداوار (یہ دو مختلف چیزیں بھی ہو سکتی ہیں) کی نکاسی کے لیے صارفین میں ایک طلب پیدا کی جاتی ہے، اور انھیں باور کرایا جاتا ہے، اور احساس دلایا جاتا ہے کہ فی الواقع انھیں ان مصنوعات کی ضرورت ہے!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نئے معاشی نظام نے ---- جو منڈی کی معیشت کے نام سے بیسویں صدی پر محیط نظر آتا ہے --- مغربی دنیا کے ملکوں میں یک گونہ خوش حالی میں اضافہ کیا (جو اٹھارویں، انیسویں صدی میں استعمار اور کمزور ملکوں کی براہ راست لوٹ کھسوٹ کے نتیجے میں پہلے ہی مادی ترقی کی راہ پر گامزن ہو گئے تھے، کیونکہ وہاں تعلیم اور تحقیق و ترقی کے لیے فاضل سرمایہ دستیاب تھا)۔ مگر دوسری جنگ عظیم کے بعد روایتی استعمار کے بتدریج خاتمے کے بعد اس خوش حالی اور لوٹ کھسوٹ کو جاری رکھنے کے لیے، دوسرے حربوں کی ضرورت تھی۔ منڈی کی معیشت کے فلسفے نے اس میں استحصالی طبقات کی پوری پوری مدد کی۔ یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ ان ممالک میں وسائل کے بے محابا استعمال (اور ضیاع) سے زندگی کی کیفیت میں جو بہتری نظر آتی ہے، اس میں اور وجوہ کے علاوہ، خود ان ملکوں کے کروڑوں محنت کشوں (یعنی عام شہریوں) کا استحصال بھی ہے، جو بہتر "زندگی" اور "زیادہ اشیاے صرف" کے لیے کولھو کے بیل کی طرح معاشی چکر سے باہر نہیں نکل سکتے اور ایک "معاشی حیوان" کے طور پر زندگی گزارنے پر مجبور کر دیے گئے ہیں۔ اس کے صلے میں انھیں جو اشیا / خدمات ملتی ہیں، انھیں بلند تر معیار زندگی کے اشارے بتایا جاتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس صدی میں انسانوں کی اوسط عمر میں اضافہ ہوا ہے (خصوصاً مغربی یورپ اور شمالی امریکہ میں)، وہ بہتر کھاتے پیتے، پہنتے اوڑھتے اور رہتے ہیں۔ لیکن اس خوش حالی میں ایک بڑا عامل، دوسرے (اور کم "خوش نصیب") ملکوں کا استحصال بھی ہے، جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ تیسری دنیا کے ملکوں (پاکستان، بھارت، مصر، شرق اوسط اور افریقہ کے ممالک، وغیرہ) میں بھی مادی تبدیلیوں کی واضح تصویریں نظر آتی ہیں۔ ان ملکوں کو ہم دو اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں: ایک وہ ملک ہیں جہاں بعض معدنیات کی دریافت سے (جن کی مغرب کو سخت ضرورت رہتی ہے، مثلاً معدنی تیل) دولت میں بے پایاں اضافہ ہوا ہے۔ اس دولت سے وہ اشیا اور خدمات خریدی جاتی ہیں، جو ترقی کی علامت سمجھی جاتی ہیں۔ ایسے ممالک میں سعودی عرب، خلیج کی دوسری ریاستیں، برونائی اور بعض افریقی ملک شامل ہیں / تھے (مثلاً نائیجیریا، جو اس صدی کے وسط میں افریقہ کا ابھرتا ہوا آفتاب تھا، جو جلد ہی غروب ہو گیا)۔ دوسری طرف وہ ملک ہیں، جہاں آبادی کے تناسب سے اس "مفت کی" معدنی دولت کی ریل پیل نہیں (مثلاً بھارت، پاکستان، مصر اور بہت سے دوسرے "ترقی پذیر" ملک)۔ ان ملکوں میں بھی مادی تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ پاکستان ہی کو دیکھیے۔ آج ملک میں جتنی کاریں، ایئرکنڈیشنر، ٹی وی، ریڈیو، موٹر سائیکلیں، مہنگے اسکول اور شفاخانے اور اس طرح کی بہت سی چیزیں نظر آتی ہیں، جو اعلیٰ تر معیار زندگی کی علامت ہیں، اب سے ۳۰ سال پہلے وہ اس تعداد میں موجود نہ تھیں۔ ان سب میں آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ کیا یہ ترقی کے اشارے نہیں جو سرمایہ دارانہ معیشت نے فراہم کیے ہیں؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس سلسلے میں کئی باتیں قابل غور ہیں:

پہلی بات تو یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت (بازاری معیشت)' اور صنعت و تکنیات کا داعیہ (imperative) ہی یہ ہے کہ ایسی مصنوعات کو زیادہ سے زیادہ پیدا کیا جائے (جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں' اس کے بغیر یہ نظام چل ہی نہیں سکتا)۔

دوسری بات یہ ہے کہ پیدائش بر پیمانہ کبیر کے بعد مسئلہ ان مصنوعات کی نکاسی اور انھیں ٹھکانے لگانے کا آتا ہے۔ اگر لوگوں میں سکت اور قوت خرید ہی نہ ہو' تو یہ اشیا فروخت کیوں کر ہوں گی' اور اگر فروخت نہ ہوں گی' تو پھر لامحالہ ان کی تیاری بھی بند کرنی ہو گی۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ صارفین کا ایک طبقہ پیدا کیا جائے' جو انھیں خریدنے کی استطاعت رکھتا ہو۔

تیسری بات یہ ہے کہ استطاعت کے ساتھ ساتھ لوگوں میں ان اشیا کے لیے ایک طلب بھی پیدا کی جائے کہ وہ ان کو خریدنے پر آمادہ ہوں۔ اگر انھیں ان کی ضرورت نہ ہو' تو ضرورت کو پیدا کیا جائے' خواہش نہ ہو' تو خواہش کو پیدا کیا جائے' اور پھر اسے فروغ دیا جائے۔ پرانا محاورہ تھا کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے' مگر اس نظام میں ایجاد' ضرورت کی ماں ہوتی ہے۔

غیر ضروری ضروریات (جن پر اب تیسری دنیا کے متوسط اور نچلے طبقے کے لوگ بھی کافی خرچ کر رہے ہیں)' میں صرف آرائش جمال' غازے' شیمپو' پرفیوم اور اس طرح کی درجنوں اشیا ہی شامل نہیں' جن سے ہمارے بازار اور دکانیں بھری پڑی ہیں' اور جن کی خریداری پر گھریلو میزانیے کا اچھا خاصا حصہ نکل جاتا ہے۔ ان اشیا میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں' جو ہماری "کوڑا خوری" کی تسکین کا باعث ہوتی ہیں (junk food)[1]' نرم مشروبات' شرابیں' سگریٹ وغیرہ۔ ان میں سے بعض چیزیں تو ہم (اور تیسری دنیا کے دوسرے ملک) براہ راست باہر سے درآمد کرتے ہیں' (سعودی عرب اور بہت سی خلیجی ریاستوں کے بازاروں کا تصور کیجیے' اور اگر یہ مشکل ہو' تو اپنے ہی ملکوں کے "باڑا بازاروں" کی سیر کیجیے) یا انھیں اپنے ملک میں تیار کر کے اپنے عوام کا معیار زندگی بلند کرتے ہیں۔[2]

اب اگر بازاروں میں ان اشیا کی ریل پیل' اور عوام میں ان کا صرف ہی ترقی ہے' تو بے شک سرمایہ دارانہ نظام کے زیر سایہ ساری دنیا' اور تیسری دنیا کے بہت سے ملک بھی' ترقی کی دوڑ میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ بہت سی اشیا کی ضرورت اس مخصوص صنعتی معیشت کی پیداوار ہے' جس میں زندگی گزارنے پر ہم مجبور کر دیے گئے ہیں۔ اسکوٹروں اور کاروں کی تعداد ہی کو لیجیے۔ موجودہ صنعتی نظام نے بیسویں صدی میں بڑے بڑے شہروں کو جنم دیا۔ قطع نظر اس کے کہ ان بڑے شہروں میں شور' گندگی'

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فضائی اور برقیاتی آلودگی جیسے غیر مطلوب عواقب سامنے آئے' اب بڑے بڑے فاصلوں کے نتیجے میں ذرائع آمدورفت میں بے تحاشا اضافہ بھی ناگزیر ہو گیا' اور ان کے نتیجے میں مزید شور' آلودگی' حادثات' وقت کا ضیاع' کوفت اور پریشانیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔

بہرحال' سائنسی و فنیاتی ترقی اور معاشیات کے ایک مخصوص نظریے کے گٹھ جوڑ نے وہ دنیا تشکیل دی ہے جس میں آج ہم رہ رہے ہیں۔ اس میں وسائل کی فراوانی' ان کا بے محابا استعمال (اور ضیاع) بھی ہے' اور افلاس و محرومی بھی۔ غالب قوتوں کی قہاری بھی ہے' اور مغلوبوں کی مجبوری بھی' جو دنیا کے سیاسی نقشوں پر اپنی متعین سیاسی حدود میں بھی اپنے جہازوں کی پرواز' اپنی زرعی و صنعتی پیداوار کا تعین کرنے' اور اپنی فنیات کو ترقی دینے میں بھی آزاد نہیں' اگرچہ رسمی طور پر ان کا شمار "آزاد" ملکوں میں ہوتا ہے۔

مگر یہ سب کچھ اچانک نہیں ہو گیا۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں جوع الارض' استحصال اور نفع خوری کی جو گھٹائیں' بلاؤں کی صورت میں مغرب سے مشرق کی طرف امنڈتی آ رہی تھیں' بیسویں صدی میں انھوں نے واضح طور پر ایک متعین اور بلامزاحمت کام کرنے والے نظام کی صورت اختیار کر لی تھی۔ بائیں بازو کے دانش وروں نے اسے فوجی' صنعتی مرکب (military- industrial complex) کا نام دیا۔ مگر یہ صرف صنعت و فوج ہی کا گٹھ جوڑ نہ تھا۔ اس میں وہ سارے طبقے شامل ہو گئے' جو دفاع سے محروم یا کمزور عوام / اقوام سے ان کا حصہ چھیننے یا ان پر پلنے میں کسی تکلف کے روادار نہ تھے۔ اور وہ افراد بھی جو اپنی برتر "دانش"' "سائنسی یا دوسری صلاحیتوں" یا "علم و حرفت" کی بنا پر ایک طبقے کے بلند معیار زندگی کو دیکھ کر خود بھی اس گاڑی میں بیٹھ جانے کے آرزومند تھے' جو "کامیابی" کی شاہراہ پر رواں تھی۔ معاشی خوش حالی اور برتری---- چاہے وہ کمزور قوموں کو میدان جنگ میں شکست دے کر اور عملاً ان کے علاقوں پر قابض ہو کر حاصل ہو' یا دوسرے طریقوں سے ان کے معدنی' زرعی اور انسانی وسائل کا استحصال کر کے---- ساری تگ و دو کی اصل غایت قرار پائی۔ نوآبادیات کے اس دور میں صرف ملکوں ہی پر قبضہ نہیں کیا گیا' بلکہ ایشیا اور افریقہ کے باشندوں کو رسمی یا غیر رسمی طور پر غلام بنا کر ان کے خون پسینے کو زر' اشیا اور اپنے بلند معیار زندگی کے قالب میں ڈھالا جاتا رہا۔(۳)

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں' مغرب' اور اس کے زیر اثر ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ کے تمام ملکوں میں جس مذہب کو فروغ ہوا' وہ نفع اندوزی کا مسلک (cult) تھا۔ انسان کی ساری تگ و دو کا مقصد ایک ہے: زیادہ سے زیادہ نفع۔ انیسویں صدی ہی میں صنعت و حرفت اور اس کے نتیجے میں سرمایہ داری کے فروغ کے ساتھ ساتھ اس کے بھیانک نتائج سامنے آنے لگے تھے۔ کارل مارکس اور اس کے پیش رو انسان دوست حکما

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے جو صدائے احتجاج بلند کی اور پستے ہوئے طبقوں کی حمایت کا جو بیڑا اٹھایا' اس کے نتیجے میں بالآخر ۱۹۱۷ کا وہ خونیں انقلاب رونما ہوا جس نے سرمایہ دار اور نوآبادیات پر قابض طبقوں میں کپکپی پیدا کر دی۔[۴] بیسویں صدی کا تقریباً تین چوتھائی اسی کشمکش کی نذر ہو گیا۔

لیکن انسانی عقل کے پیدا کردہ اس انقلاب کے پیچھے چونکہ کوئی درست فکری اساس نہ تھی اور یہ الہامی ہدایت سے بے بصر تھا' اس کا نتیجہ بھی یہی نکلا کہ ایک خطے میں (ساری دنیا میں نہیں) ایک استحصالی طبقے کے استیصال کے بعد ایک دوسرا استحصالی طبقہ وجود میں آگیا' جو اپنے پیش رووں سے بھی زیادہ ظالم' جابر اور سفاک ثابت ہوا۔

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو' پھر کیا!
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

بیسویں صدی کے آخری عشرے کی ابتدا ہی میں بالآخر سوشلسٹ انقلاب کا اولین گہوارہ --- "سوویت یونین"--- ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں جو بین الاقوامی اشتراکی تحریکیں ایک ہمہ گیر انقلاب کا عزم لے کر اٹھی تھیں' منتشر ہو گئیں۔ کہا جانے لگا کہ یہ "سرمایہ دارانہ نظام" کی فتح ہے۔ بالآخر اس کا متبادل اور حریف نظام' جو ساری دنیا میں اس کی جگہ لینے کا دعوے دار تھا' فنا کے گھاٹ اتر گیا۔ سرمایہ داری کی فتح' دراصل "منڈی کی معیشت" کی فتح ہے اور منڈی کی معیشت کیا ہے؟ یہ کہ ہر شخص کو آزادی ہو کہ وہ اپنے نفع کو زیادہ سے زیادہ کر سکے۔ نفع کی تحریک (profit incentive) اور نفع کا محرک (profit motive) ہی اصل حقیقت قرار پائے۔ کہا جاتا ہے کہ یہی نظام معیشت ایک فطری نظام ہے' جو معیشت (اور "معاشی حیوان") کو مصنوعی جکڑبندیوں سے آزاد کرتا ہے' اور بالآخر اس کی فلاح کا ضامن ہے۔

لیکن اب' جبکہ سرمایہ دارانہ نظام کا کوئی قابل ذکر حریف باقی نہیں بچا ہے' دنیا کی صورت حال کیا ہے؟ ساری دنیا میں آزاد معیشت اور نج کاری کے دور میں دنیا کی آبادی کا ۲۰ فی صد حصہ غربت کی سطح سے بھی پست زندگی گزار رہا ہے' اور اس کے حصے میں دنیا کی کل دولت کا ۱ء۵ فی صد آتا ہے۔ غریب' غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ بڑھتی ہوئی غربت صرف تیسری دنیا کا ہی مسئلہ نہیں' ترقی یافتہ پہلی دنیا بھی اس میں مبتلا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا میں ہر روز ۳۵ ہزار مرد' عورت اور بچے بھوک سے مرجاتے ہیں جبکہ شمالی امریکہ اور مغربی یورپ میں غلے کے انبار' دودھ کی جھیلیں' مکھن کے پہاڑ اور گوشت کے ڈھیر ضائع کر دیے جاتے ہیں کہ قیمتیں کم نہ ہو جائیں۔ دنیا کے ۲۰ فی صد امرا' کل دولت کا ۵۰ فی صد سے زیادہ لے اڑتے ہیں' اور عالمی پیمانے پر ۶۵ء۰ فی صد افراد' ساری دنیا کے ۶۰ فی صد وسائل اور دولت پر قابض اور متصرف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں۔ وقیع برطانوی جریدہ دی اکنامسٹ شکوہ کرتا ہے: "آج امریکہ اور برطانیہ میں آمدنیوں کا تفاوت جس سطح پر ہے، پچھلے ۵۰ سالوں میں کبھی اتنا نہیں رہا۔ دوسرے صنعتی ملکوں میں بھی پچھلے دو ایک عشروں میں امیر اور غریب کے درمیان خلیج میں اضافہ ہی ہوا ہے (اگرچہ ماضی میں بھی یہ تفاوت بہت تھا)۔ برطانیہ میں کمیشن برائے سماجی انصاف نے، جو (اس وقت کی) حزب اختلاف، لیبر پارٹی کے ایما پر قائم ہوا تھا، دولت کی ریل پیل کے درمیان غربت کی ایک بھیانک تصویر پیش کی ہے۔ اگرچہ مارکس کی یہ پیش گوئی ابھی تک پوری نہیں ہوئی کہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت پرولتاریہ انتہائی غربت کے قعر میں جا پڑیں گے، تاہم امیر اور غریب کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج بعض لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر رہی ہے، کہ مارکس آخر کار سچ ہی کہتا تھا" (۵ نومبر، ۹۶)۔

کیا استحصال کے نظام کی یہ موجودہ شکل، جس کا نام سرمایہ داری ہے (جس کا پیش رو، نو آبادیاتی نظام، اور اس سے پہلے جاگیرداری نظام تھا)، اسی شکل میں باقی رہے گی؟ ۹۰-۱۹۸۹ میں اشتراکیت کے زوال اور سوویت یونین کے انہدام کے بعد منڈی کی معیشت کے حامیوں اور عالموں نے پھر لوس لمن الملک بجانا شروع کر دیا ہے۔ لیکن مغرب ہی کے بعض دانش ور علماے معاشیات، سرمایہ داری کے موجودہ نظام کے ڈھانچے میں شکستگی کے آثار بھی دیکھ رہے ہیں۔ آج دنیا کی تین غالب معاشی قوتوں---- امریکہ، جاپان اور مغربی یورپ---- کے عالمی تسلط کے پیچھے ان کی کمزوریوں کو تلاش کرنا آسان نہیں۔ لیکن میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے لسٹر تھوراؤ (Lester Thurow) کا خیال ہے کہ یہ نظام اپنے عروج کی بلندیوں کو چوم کر اب رجعت اور زوال کا رخ ہی کر سکتا ہے۔ ان کے خیال میں امریکہ کو ایک ایسی معیشت کی ضرورت ہے، جو اس کے اپنے شہریوں کی ضروریات کو پورا کرنے کا رجحان رکھتی ہو۔ کوئی بھی ملک، چاہے اس کی معیشت کا حجم امریکہ جتنا ہی کیوں نہ ہو، دائمی تجارتی خسارے کو نہیں سہار سکتا۔ وہ عالمی مالیاتی منڈیوں سے چاہے جتنا قرض لے لے، اور اپنے تاجرانہ ہتھکنڈوں سے عالمی بازاروں کو چاہے جتنی چترائی سے زیر و زبر کرتا رہے، اہل بازار کی بھی اپنی ایک منطق ہے، اور اس کا حشر بالآخر میکسیکو سے مختلف نہیں ہو گا۔ جاپانی معیشت، حد سے زیادہ گرم ہو کر پہلے ہی آمادۂ زوال ہے۔ اور مغربی یورپ میں معاشی زوال کے آثار پہلے ہی نمایاں ہو چکے ہیں، کیونکہ ۱۰ فی صد بے روزگاری اب معیشت کی ساخت کا معمول بن گئی ہے، کیونکہ ترقی یافتہ ممالک کے اعلیٰ مہارتوں کا تقاضا کرنے والے معاشی میدان میں کم ہنرمندوں / بے ہنر لوگوں کے لیے کوئی مقام نہیں رہا۔ (۵)

"دنیا کی معیشت ایسی ڈرامائی تبدیلیوں سے دوچار ہے جسے ارتقائی حیاتیات سے ایک استعارہ لے کر ہی واضح کیا جا سکتا ہے، اور وہ ہے "موقوفی توازن" (punctuated · equilibrium)۔ ارتقائی تاریخ کے ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ادوار میں ہوتا یہ ہے کہ طبعی ماحول میں اچانک ایسی زبردست بنیادی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں کہ غالب نوع (حیوانی) سرعت کے ساتھ فنا کا شکار ہو جاتی ہے' اور اس کی جگہ ایک دوسری نوع نمودار ہو جاتی ہے۔ اس کی سب سے اچھی مثال جو ہمیں معلوم ہے' ڈائنوسار (گرگٹ نما مہیب عظیم الجثہ حیوانات) کی نابودگی ہے۔ انھوں نے ۱۳۰ ملین (۱۳ کروڑ) سال کرۂ ارض پر حکمرانی کی' اور پھر اچانک فنا ہو گئے..." (دی اکنومسٹ' ۹ مارچ' ۹۶)۔

تھوراؤ نے معاشیات کی دنیا میں موسموں کی اچانک تبدیلیوں کے پانچ عوامل بتائے ہیں: "اولاً' اشتراکیت کا خاتمہ' جس کے نتیجے میں انسانی آبادی کا ایک تہائی حصہ' جو کرۂ ارض کے ایک چوتھائی رقبے پر پھیلا ہوا تھا' اچانک ایک مختلف نظام (سرمایہ داری) کی طرف دوڑ پڑا۔ دوسرے' نفسیاتی انقلاب' جس میں انسانی ساختہ دماغی قوت (کمپیوٹر انفارمیشن ٹیکنالوجی یا اطلاعی فنیات) کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ تیسرے' انسانی آبادی کا ایک بالکل نیا منظر' جس میں دیکھنے میں یہ آ رہا ہے کہ دنیا کے غریب ترین ملکوں میں آبادی دھماکہ خیز شرح کے ساتھ بڑھ رہی ہے' اور امیر ملکوں میں نسبتاً خوش حال بوڑھے لوگ اپنی آمدنی کے لیے پیرانہ سالی کے سرکاری وظائف پر پل رہے ہیں (کام کے بغیر عیش!)۔ چوتھے' ایک عالمی معیشت کا فروغ' جہاں ملک ٹوٹ رہے ہیں' جبکہ علاقائی تجارتی بلاک نشوونما پا رہے ہیں' اور بڑے بڑے کاروبار ایک دوسرے سے پیوست ہوتے جا رہے ہیں۔ اور پانچویں یہ کہ دنیا ایک نئی صدی میں داخل ہو رہی ہے' جہاں کوئی غالب' معاشی' سیاسی اور فوجی طاقت کا وجود نہیں رہے گا۔

متذکرہ پانچ عوامل پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ ان کے علاوہ چند اور عوامل بھی ہیں' جو عالمی اقتصادی منظر پر اثرانداز ہو رہے ہیں۔ اولاً یہ کہ ساری دنیا میں' خصوصاً "ترقی پذیر" ممالک میں اسلحہ کی تیاری' خریداری اور فوجی اسٹیبلشمنٹ کے اخراجات بڑھتے جا رہے ہیں' بعض ملکوں میں یہ اتنے زیادہ ہو گئے ہیں کہ تعلیم' معالجے اور دوسرے ضروری اخراجات کے لیے کچھ بچتا ہی نہیں۔

ثانیاً' ساری دنیا' خصوصاً تیسری دنیا اور غریب ملکوں میں ریاست اپنی ان ذمہ داریوں سے دست کش ہوتی جا رہی ہے' جو روایتاً" صدیوں سے اسی کا حصہ تصور کیے جاتے تھے۔ ان میں سرفہرست' تعلیم' صحت عامہ' روزگار اور شہری امن و امان کا قیام / تحفظ جیسی ذمہ داریاں شامل ہیں۔ اور ثالثاً ساری دنیا میں (خصوصاً مسلم ملکوں میں) اسلام کے حوالے سے "انقلابی تحریکیں" برپا ہو رہی ہیں' جو سارے مروج نظاموں کے خلاف ہیں' اور خصوصاً مغرب کے سیاسی' اقتصادی اور فکری غلبے کے خلاف معاندانہ جذبات رکھتی ہیں' اور انھیں تلپٹ کر دینے کے عزم کا برملا اظہار کرتی ہیں۔ یہ اس صدی کے وسط کے منظر سے مختلف صورت حال ہے۔ جب بڑھتی ہوئی اشتراکی قوتوں کے خلاف مغربی اور دینی عناصر اپنے مشترکہ مفادات کے تحت گٹھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جوڑ میں مصروف نظر آتے تھے۔

معاشیات کے حوالے سے عالمی منظر پر اس طائرانہ نگاہ کے بعد اب تھوراؤ کے تجزیے کی طرف آیئے۔ اگرچہ تھوراؤ کے اس پورے تجزیے سے کلی اتفاق نہیں کیا جا سکتا' مثلاً اس کی یہ پیش گوئی کہ اگلی صدی میں دنیا میں کوئی غالب معاشی' سیاسی قوت نہ رہے گی۔ نظر تو یہ آتا ہے معاشی' سیاسی' فوجی قوتوں' علوم کے بہت سے شعبوں میں اختصاص رکھنے والے ماہرین اور اسٹیبلشمنٹ کے دانش وروں (عہد قدیم کے جادوگروں اور سامریوں کے جانشین) کے مفادات کے تانے بانے ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ اس لیے عوام پر ان کی گرفت بھی مضبوط ہے' اور ہوتی جا رہی ہے۔ مستقبل' جہاں تک ہمیں نظر آتا ہے' سرمایہ' فنیات' سائنس' انصرام (managements) اور اطلاعاتی فنیات کے مزید ارتکازات کا ہے' اور ان ارتکازات کے نتیجے میں ایک عام انسان مزید جتنا لاچار اور بے بس ہو جائے گا' انسانی آبادی کی اکثریت اپنی تاریخ میں کبھی اس دور سے نہ گزری ہو گی۔

جب غیب کی بجائے حاضر و موجود' آخرت کی بجائے عاجلہ اور روح کی بجائے جسم و مادہ اصل حقیقت اور توجہ و جہد کا ہدف قرار پائیں' تو پھر جن کے پاس زیادہ علم و اطلاع ہوں گے' انھیں زیادہ عیاری سے' جن کے پاس زیادہ صلاحیت ہو گی' انھیں زیادہ غلبے سے' اور جن کے پاس زیادہ قوت ہو گی' انھیں سفاکی سے روکنے والی چیز آخر کیا ہو گی؟ اور جب یہ ساری قوتیں اور صلاحیتیں یکجا ہوں گی' تو ان کا مآل کار کیا ہو گا؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ آیندہ صدی کے آخر تک شاید ملکوں کی سیاسی حدود بڑی حد تک بے معنی ہو جائیں'[۶] لیکن شاید غالب و مغلوب کے تفاوت میں اضافہ ہی ہو گا' سوائے اس کے کہ ویسا ہی کوئی انقلاب واقع ہو' جس نے عظیم الجثہ گرگٹوں کو نابود کر دیا تھا۔ ماضی میں ایسا انقلاب' جس نے انسانوں کو انسانوں اور دیوتاؤں کی غلامی سے چھڑایا تھا' ان کی زنجیریں کاٹ دی تھیں' ان کی پیٹھ سے ان کا بوجھ ہٹا دیا تھا' اور ان کی روح' فکر اور عمل کو آزادی بخشی تھی' محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ہی آیا تھا[۷]۔ معاشیات کی دنیا میں دولت کی گردش کا فلسفہ: كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ (الحشر ۵۹:۷) تاکہ زر تمھارے مال داروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے' اسلام ہی نے دیا تھا۔ زر پرستی کو جہنم کی خوش خبری دی گئی تھی' اور وسائل کی منصفانہ تقسیم کا حکم دیا تھا کہ فراوانی کے درمیان کوئی محرومی کا شکار نہ ہو' کسی شکم سیر کے پڑوس میں کوئی بھوکا نہ سوئے' وجہ افتخار' امارت نہیں' فقر اور درویشی ہو۔ ان' یا دوسری تعلیمات کو لے کر اب کسی نبی کو تو نہیں آنا ہے' لیکن آپؐ کے علم و حکمت کے صحیح اطلاق کے ذریعے ہی کسی مثبت اور بامعنی تبدیلی کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ ایک نوع حیوانی کے فنا ہو جانے کے بعد دنیا دوسری بدتر نوع حیوانی سے آباد ہو جائے گی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حواشی:

۱- "کن ٹکی فرائڈ چکن" "کوکا کولا، پیپسی، کئی طرح کی آئس کریم، ٹافیاں، چاکلیٹ، بسکٹ اور اس طرح کی بہت سی چیزیں یا تو باہر سے آتی ہیں، یا غیر ملکی تجارتی شراکتوں سے تیار ہوتی ہیں، جن کے منافع کا ایک حصہ بہرحال باہر منتقل ہو جاتا ہے۔

۲- یہ بات نوٹ کیے جانے کے قابل ہے کہ پچھلے عشرے میں کراچی، لاہور جیسے شہروں میں جن صنعتوں کو سب سے زیادہ فروغ ہوا، وہ ڈبل روٹی، بسکٹ، ٹافیوں اور آئس کریموں جیسی صنعتیں ہیں۔

۳- افریقہ سے آزاد انسانوں کو پکڑ کر زبردستی غلام بنا لینے کا رواج ختم ہوا، تو بیسویں صدی کے وسط میں ایک دوسری غلامی کا آغاز ہوا۔ غلامی کے اس دور نو میں غلام (چاہے وہ سائنس دان ہو، یا اپنے شعبہ علم و فن میں اختصاص رکھنے والا کوئی ماہر)، وہ بہرحال خود دوڑ کر اپنے آقاؤں کے پاس پہنچنے کی آرزو کرتا ہے، تاکہ کسی طرح ان کے ساتھ / ان کے لیے، کام کرے۔ تیسری دنیا سے صلاحیتوں کا یہ نکاس، تیسری دنیا کی غربت کے باعث بھی ہے اور اس کا باعث بھی۔

۴- یہ بات نوٹ کیے جانے کے لائق ہے کہ سرمایہ دار ممالک کے سبھی عوام "سرمایہ داری" اور "نوآبادیاتی نظام" کی برکتوں سے فیض یاب نہیں تھے۔ اور نہ اب ہیں۔ ان ممالک میں بھی ان انقلابی تحریکوں سے اصل خطرہ ان بالادست طبقوں کو تھا، جو اقتدار کے جھولے میں پینگیں لے رہے تھے۔ جب اہل سرمایہ و اقتدار نے اپنے نظام کے لیے درپیش خطرات کی بو سونگھ لی، تو انھوں نے اپنے ہاں وہ "اصلاحات" شروع کر دیں جن سے مزدوروں اور دوسرے محنت کش طبقات کو اپنی محنت کا کچھ بہتر صلہ --- اور نتیجے میں ایک بہتر "معیار زندگی" ملنے لگا۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
(اقبال)

اور "مطمئن" و "آسودہ" چوپایوں کی یہ افواج پھر خوشی خوشی اپنے کاموں میں جت گئیں۔

۵- یہ بات دلچسپی سے نوٹ کیے جانے کے قابل ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی معیشت، امریکہ میں جہاں فی کس کل قومی پیداوار میں ۱۹۷۳ء اور ۱۹۹۵ء کے درمیان ۳۶ فی صد اضافہ ہوا ہے، نچلے درجے کے کارکنوں (محنت کشوں) کی حقیقی اجرت میں ۱۴ فی صد کمی ہوئی ہے۔ یعنی انھیں اپنے ملک کی بڑھتی ہوئی خوش حالی میں زیادہ حصہ تو کیا ملتا (جو اصولاً پس ماندہ طبقات کو ملنا چاہیے کہ آسودہ طبقے کے پاس تو پہلے ہی ضرورت سے زیادہ تھا)، ان کا حصہ اور کم ہو گیا۔ ۱۹۸۰ کے عشرے میں زائد آمدنیوں کے سارے فوائد، کارگزاروں کے بالائی ۲۰ فی صد طبقے کے حصے میں آئے اور زائد آمدنیوں کا ۶۴ فی صد حصہ، چوٹی پر براجمان ایک فی صد کا حق ٹھہرا۔ دی اکنومسٹ، لندن، ۹ مارچ، ۱۹۹۶ء)۔

۶- دیکھیے: پال کینڈی (Paul Kennedy) کی کتاب: Preparing for the Twenty-First Century، Fontana Books ۱۹۹۵ میں اس کا مضمون: The Future of Nation State۔

۷- [محمد صلی اللہ علیہ وسلم] انھیں معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں، پاک چیزیں ان کے لیے حلال کرتے ہیں، اور خبیث چیزیں ان پر حرام کرتے ہیں، اور ان کا بوجھ ان پر سے ہٹا دیتے ہیں، اور وہ زنجیریں بھی جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے"۔ (الاعراف ۵۹: ۱۵۷)

© rasailojaraid.com